فلاحِ قوم کے ساماں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر شعبۂ حیات میں ایک نظام بہت اہم ہوتا ہے۔ بغیر نظام کے اس کی سہی تشکیل اور نشو نما بہت مشکل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج تمام تعلیمی اداروں میں چاہے وہ علوم عصری سے متعلق ہوں یا علوم دینی سے، وہاں ایک کامل نظام و نصاب تعلیم ہوتا ہے۔ طلبہ کو ایک جینے کا طریقہ، چیزیں برتنے کا ڈھنگ سکھا یا جاتا ہے تا کہ آگے چل کے وہ قوم و ملک کے کام آسکیں اور اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچا سکیں۔

اور یہ بات بھی آفتاب نیم روز کی طرح واضح ہے کہ ہر قوم اور ہر ملک نے اپنا ایک الگ نظام تیار کیا ہے۔ ایک ذاتی تشخص اپنے باشندوں کو دیا ہے۔ یہی اس جگہ کی خاص پہچان ہوتی ہے جسے دیکھ کر فوراً ہی اس شخص کا تعارف ہو جاتا ہے کہ یہ کس جگہ یا کس ملت کا فرد ہے۔ اگر انسان اس خاص تشخص کو چھوڑ دے تو اس میں اور ایک عام انسان میں کوئی امتیازی فرق باقی نہیں رہتا۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ ہر ملک کا اپنا ایک ملکی ترانہ ہے؟ ایک الگ ملکی جانور ہے؟ پھول حتی کہ ہر ملک کی اپنی الگ ملکی زبان ہے۔ یعنی کوئی بھی ملک اپنے اس خاص تشخص و

امتیازی شان کو کھونا نہیں چاہتا۔
ایک ضروری بات یہ ہے کہ اگرچہ ہر قوم الگ الگ پہچان کی بنا پر بٹی ہوئی ہے۔ مگر وہ یہ مانے یا نہ مانے اس کے ہم قوم لوگ اور دوسری قوم کے لوگوں کے بیچ ایک انسانیت کا رشتہ ہے۔ اور شاید اسی کی بنا پر ہم جب کوئی حادثہ یا کوئی جدال قتال کی داستاں سنتے ہیں ہمارا کلیجہ لرز جاتا ہے۔ دنیا میں امن وامان کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر نزع جو بین الاقوام واقع ہو اسے سنجیدگی سے اور بات چیت سے سلجھانے کی کوشش کی جائے۔ جب بات کرنا عبث ہو تو ضرور اسلحہ سے کام لیا جاتا ہے۔
جب اتنی گفتگو ذہن نشین ہوگئی تو یہ بات بھی سونے کے قلم سے لکھنے کی ہے کہ اگرچہ امن وامان ضروری ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایک قوم دب اور سہم کر رہے اور مفلسی وناچاری کا رونا روتی رہے جب کہ باقی اقوام اسے ذلیل وخوار سمجھیں۔ کچھ باتیں ہر قوم کی ایسی ہوتی ہیں جن پر وہ کوئی بھی سمجھوتا کرنے کو راضی نہیں ہوتی۔ اور یہی وہ مسئلہ ہوتے ہیں جہاں دیگر قوموں کو بردباری سے کام لیکر اس ایک قوم کے جذبات کا ادب واحترام کرنا چاہیے۔ مگر افسوس! کہ یہ بھی روا نہیں ہے آج کے وقت میں۔ کتنے ہی امن و امان کے درس دینے کے باوجود اس مسلم قوم کو مجرم ودحشت گرد قرار دیا گیا۔

اور اس کے پر امن اقدامات کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے اور اس کے دین کو عالم میں مجروح کرنے کی کوشش کی گئی۔

مگر ہر مسلم کو اب یہ سوچنا چاہیے کہ کیا اس نے خود ہی اپنی شناخت کو دنیا میں باقی رکھنے کا کوئی کام کیا؟ کیا اس نے اپنی قومی اور ملی ذمہ داری کو سمجھا؟ کیا محض اپنی فلاح اور اپنی بلندی ہی اس کا واحد مقصد بن چکا ہے؟ کیا دوسرے مسلمانوں کا خون اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟ اس جگہ پر ہم سے بہت بڑی کوتاہی ہوئی ہے! ہم نے ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش تماشائی بنے تماشا دیکھا ہے۔ اور ہم شاید اس امید میں بیٹھے ہیں کہ ہمیں چاندی کی تشتری میں ہمارا مقام اور عزت لا کر دے دی جائے گی اور اس کے لئے کوئی محنت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے اس وقت کا۔ ہم فقط تنقید اور تبصرہ کرنا جانتے ہیں جب کہ عملی میدان میں ہم بالکل بھی نہیں اترنا چاہتے۔ ممکن ہے کہ یہ تلخ بات کسی کو بری لگ جائے۔ مگر یہ بات حقیقت کے بہت قریب ہے۔ دوستوں کیا وہ ہم ہی نہیں ہیں کہ جنہوں نے اپنے کریم آقا صلی اللہ علیہ و سلم کی پیاری پیاری سنتوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے؟ اور اکثر اوقات کو محض لہو و لعب میں بسر کرتے ہیں۔ جب کبھی ہمیں نصیحت کی جاتی ہے تو ہم اس پر کان نہیں دھرتے۔ جب یہ سب حقیقت ہے تو سوچنا چاہیے کہ اب بھی وقت

ہے۔ کہ امت کے بکھرے شیر ازے کو رسمیٹا جا سکتا ہے۔ اسے متحد و مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ مگر شرط وہی ہے جو ہمیشہ سے تھی۔ کہ اتحاد ہو مگر بے غیرت اتحاد نہیں۔ اپنے جو روٹھے ہیں انہیں تو منایا جا سکتا ہے۔ مگر غیر کے در پر کبھی بھی سر تسلیم خم نہ ہوا ہے اور نہ کبھی ہو گا۔

ہماری حالت جب ہی سدھرے گی کہ جب ہم اپنے اور پرائے کی صحیح پہچان جان کر اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کریں۔ نہ غیروں سے اس قدر ہم آہنگی ہو کہ شریعت کے احکام بھی ملحوظ نہ رہیں۔ اور نہ اپنوں پر اتنی شدت ہو کہ پھر بات بنائے نہ بنے، یا کسی کے دل کو تکلیف ہو۔ کیوں کہ اس سے نقصان اپنا ہی ہوتا ہے۔ غیر کا نہیں۔ احقاق حق ضروری ہے، اور کرنا بھی چاہیے۔ مگر طریقۂ اصلاح بھی ضرور معنی رکھتا ہے۔ کہ اس کے بغیر احقاق حق تو ہو سکتا ہے مگر شاید اصلاح نہ ہو پائے بس اسی کا خیال اور رکھنا چاہیے۔ یہ بھی یاد رہے کہ کسی کے آپسی اختلاف سے عوام میں ہر گز بحران نہ پھیلے۔ ورنہ وہ علمی اختلاف کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟ کیا ایسے اختلاف میں ایک قسم کی ذاتیات سے متعلق بو نہیں ہے؟ اگر ہے تو اسے دور کیا جائے کہ یہ اہل علم کا شیوہ نہیں ہے۔ اور اگر اس کا کوئی شبہ تک نہیں ہے تو پھر اختلاف صرف اہل علم ہی کے درمیان رہے اور عوام کے سامنے کسی بھی باوقار شخص کے تقدس کو پامال نہ کیا جائے۔ اور اس

سے عوام کے اذہان پر فرق نہ آئے کہ یہ تو محققین کے درمیان ایک علمی بحث ہے۔ علمی نکات پر تبادلۂ خیال ہے۔اس میں عوام کا کیا کردار؟

ہاں کردار ہے تو کچھ ایسے لوگوں کا ہے جن کی روزی روٹی شاید اسی کاروبار سے چل رہی ہے۔ ورنہ کسی کے آپسی معاملے کو عوام میں لانے کا کیا مطلب ہے؟ اس سے کس کا فائدہ ہے۔ اگر انتباہ ہی کرنا مقصد ہے، تو یہ اس شخص کو سب سے پہلے کی جائے کہ جس سے اختلاف ہے۔ کل کو یہ نہ ہو کہ جس کو آج ہم کسی کے متعلق بدظن کر رہے ہیں وہ کل ہم ہی سے بدظن ہو جائے۔اور پھر اس کو گمراہ کرنے والے کیا کم لوگ موجود ہیں؟ کیا ایسے لوگوں کی کمی ہے جو باہیں پھیلائے کھڑے ہیں کہ کوئی تو وہاں سے بدظن ہو کے آئے اور ہم اسے دام میں لیں؟اور اگر ایسا ہے تو ہر اختلاف کی نوعیت کو سمجھ کر اسی کے مطابق ہی اقدامات اٹھائے جائیں۔ قوم کے عام طبقہ کو بھی چاہیے کہ اگر کوئی تنازع اس کے سامنے آئے تو اسے ہوا نہ دے بلکہ وہ کام کرے جس سے دل قریب ہوں نہ کے ان میں اور تفرقہ پڑے۔

جب اس قوم کے افراد اس بات کو سمجھ جائیں گے اور اپنی قومی وملی ذمہ داریوں کو بھی سمجھیں گے تو اس کی فلاح رب اگر چاہے تو ضرور ہو گی اور اسے اپنا وقار واپس مل جائے گا۔

از: فردین احمد خان رَضوی

خادم: النجم اسلامک میڈیا

☆☆☆